اُردو ریسرچ جرنل "تشکیل" جلد:3، شمارہ:2 (جولائی تا دسمبر 2025ء)
ISSN (Online): 3007-3294, ISSN (Print): 3007-3286, HEC Recognized Y-Category Journal

عبداللہ
ایم فل اُردو اسکالر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

ناول "خس و خاشاک زمانے" میں بدیسی کردار: تجزیاتی مطالعہ

Abdullah
Mphil Urdu Scholar, GCU, Lahore

Foreign Characters in Novel Khas o Khashak Zamany: An Analytical Study

ABSTRACT

Mustansar Hussain Tarar is one of the most popular contemporary writers of Urdu literature, best known for his travelogues and novels. In his novel Khas-o-Khashak Zamanay, the foreign characters are portrayed as dynamic, multidimensional, inquisitive, persistent, and self-made individuals. The author has drawn upon his lifetime experiences and deep observations to imaginatively create these characters especially Inam Ullah, Akbar Jahan, Roshan, Richard Jahan, Bakht Jahan (Junior), Seerat Jahan, Shabahat and Mouti. This article examines various tendencies reflected in foreign characters such as their innate instincts, racial pride, cultural interactions and cultrural conflicts.

Keywords: *Mustansar Hussain Tarar , Khas o Khashak Zamany, Foreign characters, Urdu Novel, Travelogue, Cultural conflict, Racial pride, Persistence*

مستنصر حسین تارڑ ایک ہمہ جہت تخلیق کار ہیں جنھوں نے بطور اداکار، ڈراما نویس، کالم نویس، سفر نامہ نگار، افسانہ نگار اور ناول نگار مقبولیت حاصل کی۔ وہ نہ صرف پاکستان کے مقبول لکھاری ہیں بلکہ اُردو ادب کے سنجیدہ قارئین اور نقادانِ ادب کے حلقہ میں بھی ان کا مقام و مرتبہ مسلم ہے۔ ان کے ناولوں میں "بہاؤ"، "راکھ" اور "خس و خاشاک زمانے" اُردو ادب کا اہم اثاثہ ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول "خس و خاشاک زمانے" ۲۰۱۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ موضوعاتی اور کرداری لحاظ سے یہ ناول دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں تقسیمِ ہند سے قبل کی تہذیب و ثقافت، مسلمانوں اور سکھوں کے مابین دوستانہ تعلقات، تقسیمِ ہند کے فسادات، سقوطِ ڈھاکہ، اقدار و روایات، پاکستانی سیاسی منظر نامہ، نسلی تفاخر، بدیسی بیزاری اور انسانی نفسیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کے پہلے حصے کے کرداروں میں بخت جہان، امیر بخش، عزیز جہان، سرو سانسی، سوہن سنگھ، لہناں سنگھ، ماہلو، بھاگ بھری اور امرت کور نمایاں ہیں۔ ناول کا دوسرا حصہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کے المیوں، ضیاء الحق عہد کی حشر سامانیوں، خوابوں کے معدوم ہونے کی داستانوں، اسلاموفوبیا، حیات و موت کی کشمکش، طبقاتی تقسیم، تہذیبی ٹکراؤ، مذہبی تکثیریت، بلا سفیمی، احساس برتری، انسانی

Tashkeel-Article (3-2-12) Published on 30-12-2025, Pages (140-162)
Email: tashkeel@uoj.edu.pk , Website (OJS): tashkeel.uoj.edu.pk
Department of Urdu, University of Jhang, Chiniot Road, Jhang, Punjab, Pakistan.

رویوں، پردیس میں اجنبیت کے احساس اور نائن الیون کے بعد پاکستانی نژاد امریکیوں اور کینیڈین مسلم شہریوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے ناروا سلوک کی داستان ہے۔ منشایاد اس ناول کی موضوعاتی وسعت کے متعلق رقم طراز ہیں:

> "اس ناول کا کوئی ایک موضوع متعین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہر اچھے ناول کی طرح یہ بھی اپنے اندر زندگی کے سارے ہی رنگ اور ذائقے لیے ہوئے ہے اور اسے کسی ایک جگہ، ملک اور زمانے تک محدود نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں کئی زمانے اور برصغیر پاک و ہند اور دنیا کے بہت سے اہم واقعات و سانحات اور تاریخی حوالے ملتے ہیں۔ تاہم آسانی کے لیے ہم اسے ایک سماجی، سیاسی اور فکری ناول کہہ سکتے ہیں۔"(1)

ناول کا دوسرا اور آخری حصہ جہاں دیدہ ادیب کے گہرے تجربوں کا کامیاب اور بھرپور اظہاریہ ہے۔ ناول کے دوسرے حصے میں بدیسی کردار سب سے متحرک اور جاندار ہیں۔ ان کرداروں میں انعام اللہ، اکبر جہان، روشن، رچرڈ جہان، بخت جہان (جونیئر)، سیرت جہان، شباہت اور موتی سب سے نمایاں کردار ہیں۔ ان کے علاوہ چند ضمنی بدیسی کردار بھی ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ "خس و خاشاک زمانے" کے کردار ایک وسیع دنیا کے حقیقی کردار ہیں جن کی ظاہری زندگی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان کی باطنی نفسیات کو بھی ناول نگار نے مدِ نظر رکھا ہے۔ بالخصوص ناول کے بدیسی کردار ایسے کردار ہیں جنھیں مصنف نے اپنی گزشتہ حیات کے گہرے تجربوں کو مدِ نظر رکھ کر تشکیل دیا ہے۔ "بدیسی کردار" ایک ثقافتی اصطلاح ہے جس سے مراد ایسے کردار ہیں جو تہذیب و ثقافت اور جغرافیے کی سطح پر ناول کے مقامی کرداروں سے مختلف ہوں۔ "خس و خاشاک زمانے" کے تمام بدیسی کردار روایتی، نسلی، سماجی، ثقافتی و تہذیبی اعتبار سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ناول میں یہ کردار تہذیبی ٹکراؤ، ثقافتی تصادم اور دیگر سماجی تضادات کو اجاگر کرتے ہیں۔

انعام اللہ بدیسی کرداروں میں مرکزی ہے۔ یہ کردار ناول کے دوسرے حصے کا سب سے فعال اور متحرک کردار ہے۔ ناول کے نصف حصے کے بعد پوری کہانی اسی کردار کے گرد گھومتی ہے۔ معتدل مگر مستقل مزاج، ہمت، حوصلہ، متانت، سنجیدگی اور دیگر اعلیٰ اوصاف اور متجسس روح رکھنے والا پہلو دار کردار ہے۔ اس کردار کا ایک پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ ایک لاوارث نومولود بچہ ہوتا ہے جسے لاہور کی ایک مسجد کی سیڑھیوں پر سروسانسی اٹھا کر لاتا ہے۔ مسجد کے نمازی اور نعت خواں اس کے حرامی ہونے پر اسے سنگ سار کرنے کے لیے پتھر اٹھاتے ہیں تو سروسانسی اس بچے کو گلے لگائے گھر لے آتا ہے۔ اس بچے کے ذریعے ناول نگار نے سماج میں موجود حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والوں کی عکاسی کی ہے۔ اس نومولود بچے کو سروسانسی پپو کا نام دیتا ہے، امیر بخش اور عزیز جہان انعام اللہ کا جبکہ سوہن سنگھ اسے لبھا سنگھ پکارتا ہے کیوں کہ نومولود بچہ خدا کی طرف سے ملا ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بچہ

جوان ہوتا ہے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ شعوری عمر کو پہنچنے کے بعد ایک ہی سوال پریشان کرتا ہے کہ کیا وہ حرامی ہے؟ وہ اپنے باپ سے یہ سوال پوچھتا ہے۔ اس کا باپ سروسانسی اسے تکلیف نہیں دینا چاہتا تاہم وہ اس پر اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ تیری سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ تو آزاد ہے۔ عقیدہ و مذہب کی جکڑ بندیوں سے آزاد اس دھرتی کا ایسا بیٹا ہے جو کسی عقیدے یا مذہب سے بندھا ہوا نہیں ہے۔ اس تجسس اور تلاش میں کہ آخر وہ کس کا بیٹا ہے؟ وہ ایک روز گورومانگٹ لاہور کی مسجد کے امام میاں غلام رسول سے ملاقات کرتا ہے تو اپنے متعلق ساری حقیقت جان جاتا ہے اور اپنے ساتھ سروسانسی کی بے لوث محبت سے آگاہ ہوتا ہے۔

انعام اللہ کے کردار کا دوسرا پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ امریکہ کے شہر نیویارک میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ نیویارک میں وہ کچھ عرصہ گلیوں کا کوڑا کرکٹ اٹھانے کے بعد ایک گروسری سٹور چلانے کا کام کرنے اور آخر کار ایک ٹیکسی ڈرائیور کا پیشہ اپناتا ہے۔ ایک عرصہ نیویارک کی گلیوں کی غلاظت ڈھونے کے بعد بریڈ فورڈ سٹریٹ پر واقع شراب خانہ "مچلی" اس کی پناہ گاہ بنتے ہیں۔ اس شراب خانے میں وہ ایک نشست کے اوپر لگے مشہور امریکی ناول نگار اور مصنف ارنسٹ ہیمنگوے کے پورٹریٹ سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ اس پورٹریٹ کے نیچے موجود نشست پر بیٹھنا اس کا خواب بن جاتا ہے۔ اس شراب خانے میں اس کے چار دوست جولیا جوائے، مریم حبیب، ہزارہ اور گستاف کا طویل گفتگو کرنا ایک مستقل عمل بن جاتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران انعام اللہ کا کردار بطور ایک ادیب منظر پر آتا ہے۔ انعام اللہ ایک ایسا ادیب ہے جس نے اپنے باپ امیر بخش سے ہمیشہ سچائی اور جرآت مندی سیکھی ہے۔ اپنا راستہ خود پیدا کرنا اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا اس کی سرشت میں شامل ہے۔ وہ جب پاکستان میں مقیم تھا تو ایک جرت مند، نڈر و بے باک صحافی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ صحافی کے ساتھ وہ ایک ایسا ادیب بھی ہے جس نے ایک ناول بنام "ایک حرامی کی سرگزشت" (An Autobiography of a Bastard) لکھ رکھا ہے۔ اس ناول پر پاکستانی معاشرے کے شدت پسند لوگوں نے اسے عتاب کا نشانہ بنایا تو اپنے والد امیر بخش کی نصیحت پر وہ پاکستان چھوڑ کر امریکہ آجاتا ہے۔ امریکہ میں اس کا دوسرا ناول "ٹیکسی ڈرائیور اے پراسیچیٹیوٹ" (Taxi Driver A Prostitute) کا مسودہ تین دفعہ نظر ثانی کے بعد اس وجہ سے لوٹا دیا جاتا ہے کہ اس میں مشرق کی پاکیزہ اخلاقیات ہیں۔ اس میں جنسی تجربوں کا کھلے ڈلے الفاظ میں بیان نہیں۔ انعام اللہ اس ناول کو ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔ انعام اللہ بطور ایک ادیب ایسا کردار ہے جو زندگی کے رنگا رنگ تجربوں سے گزرا ہوا ہے۔ ایک لاوارث بچے کے طور پر پرورش پانا، امیر بخش، عزیز جہان، سروسانسی سے باپ کی محبت حاصل کرنا، لاہور کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنا، نڈر و بے باک صحافی، آمریت کے خلاف قلمی بغاوت پر تشدد برداشت کرنا، ہجرت کا کرب، پردیس کی اجنبیت، نیویارک کے گھروں اور گلیوں کی غلاظت ڈھونا اور ٹیکسی ڈرائیور کے تجربوں سے بھرپور یہ کردار ایک ایسا بالغ النظر ادیب ہے جس کی نظر بڑی

باریک بین اور مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ وہ ایک ایسا ادیب ہے جو معاشرے کا نبض شناس ہے۔ وہ بھی انقلاب کا خواہاں ہے۔ معاشرتی رواداری، مساوات اور آزادی کا قائل ہے تاہم امریکی معاشرے میں اس کے خوابوں کو دیوانے کے خواب کی حیثیت حاصل ہے۔ انعام اللہ وسیع تجربے اور مشاہدے کے علاوہ اپنے وسعتِ مطالعہ کی بنا پر اپنے حلقہ احباب اور قاری کے لیے جاذبِ توجہ بنتا ہے۔ اس نے عالمی ادب کے بڑے ناول نگاروں کا مطالعہ کر رکھا ہے اور ان کے فلسفہ زندگی سے آگاہ ہے۔ اپنی دوست جولیا سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ہر تخلیقی ادیب ایک دلال ہوتا ہے جو اپنے اردگرد کے افراد کو اپنی تخلیقات میں کردار بنا کر بیچتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ہر تخلیقی ادیب ایک دلال ہوتا ہے جولیا۔۔ وہ اپنے نزدیکی دوستوں، عزیزوں، رشتے داروں یہاں تک کہ اپنے ہر عشق کو بیچ کھاتا ہے، کردار آسمانوں سے نازل نہیں ہوتے۔۔ ہر ناول نگار سے جو بھی اس کے قریب رہے ہوتے ہیں شاکی رہے ہیں۔۔۔ کیا گارسیا مارکیز نے اپنے کسی چچا۔۔ تایا یا پھوپھی کو بخشا ہے یہاں تک کہ اس کی زندگی میں جتنی بھی بدن فروش طوائفیں اور پادری آئے ہیں، ان کو بھی فروخت کر دیا ہے، نجیب محفوظ اور ارحان پاموک کے بیشتر عزیز رشتے دار ان سے خفا ہو گئے تھے۔۔ دوستووسکی سے اس کے بہت سے دوست یہاں تک کہ اس کی بیوی بھی ناراض ہو گئی تھی۔"(2)

انعام اللہ کی خود کلامی اور ناول کے راوی کا بیان اس کردار کی کئی پرتیں کھولتا ہے۔ نائن الیون کے بعد امریکی معاشرے میں جب اس کے ساتھ متعصبانہ سلوک کیا جاتا ہے تو وہ ہر مظلوم کی فریاد سے آگاہ ہوتا ہے اور اس کا کرب سمجھتا ہے۔ نائن الیوین کے بعد افغانیوں کے ساتھ بالخصوص اور عام مسلمانوں کے ساتھ بالعموم ہونے والے ناروا سلوک کے کرب کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھی ایک گناہگار سمجھتا ہے اور ملامتی رویے کے ساتھ آیندہ زندگی بسر کرتا ہے۔ انعام اللہ خدشات کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ افغان امریکی جنگ میں قتل ہونے والے معصوم بچوں کے کرب کو سمجھنے میں ایک سچے ادیب کے کردار کی عکاسی کرتا ہے۔ گروسری سٹور کا کاروبار چھن جانے کے بعد وہ تنہائی پسند ہو جاتا ہے۔ عزلت نشینی اور سوگواری اس کے مزاج کا مستقل حصہ بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک روز جولیا سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

> "یہ تم جو مجھے تقریباً زبردستی میرے تہہ خانے سے گھسیٹ کر باہر لے آئی ہو تو جانتی ہو میری غیر موجودگی میں کیا ہو گا۔۔۔ اس دوران بہت سی چڑیاں اور بے شمار بچے مر جائیں گے۔۔۔ بے شک تم نے اس ٹیلی ویژن کو آف کر دیا تھا۔۔۔ پر جولیا ٹیلی ویژن بند کرنے سے موتیں نہیں رکتیں۔۔۔ اور اس دوران جب کہ ہم دونوں "مچلی" میں بیٹھے ہیں تو وہاں

مسلسل چھوٹے چھوٹے دل رکتے چلے جارہے ہیں۔۔ اور ان سب کی موت کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔"(3)

ٹیلی ویژن پر امریکہ افغان جنگ سے ہونے والی تباہی، انتشار اور معصوم جانوں کے ضیاع پر وہ اس قدر صدمے کا شکار ہوتا ہے کہ معصوم بچوں کی اموات کا خود کو ذمہ دار ٹھہرالیتا ہے۔ بے وجہ معصوم لوگوں کی اموات پر وہ ایک ہمدرد اور رحم دل تخلیق کار کی عکاسی کرتا ہے۔ جنگ کی ہولناکیوں سے خوف زدہ اور ملامت زدہ گوشہ نشین ادیب اپنے سوتیلے بھائی روشن کے کہنے پر امریکہ سے کینیڈا منتقل ہو جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنی زندگی کے وسیع تر تجربے اور مشاہدے کو تخیلاتی سطح پر استعمال کر کے انعام اللہ کے روپ میں ایک ایسا کردار تخلیق کیا ہے جو اُردو ناول کی دنیا میں فقید المثال ہے۔ انعام اللہ کے کردار میں مصنف نے اس کے خارجی حالات اور باطنی کیفیات کو پیش نظر رکھا ہے۔ انعام اللہ وقت کے دوش پر سوار ایسا کردار ہے جو کبھی وقت کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے تو کبھی اس کا رخ ایک نئی دنیا کی تلاش میں موڑ دیتا ہے۔ انعام اللہ کے کردار کا تیسرا پہلو اس وقت کھلتا ہے جب وہ کینیڈا میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ ناول کے آخری حصے میں انعام اللہ کا کردار قاری کی تمام تر توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کینیڈا میں وہ اپنے کاروبار کے لیے تگ و دو شروع کرتا ہے اور بالآخر پاکستانی دست کاریوں اور کھلونوں پر مشتمل ایک دیدہ زیب سٹور کھولتا ہے جہاں اس کی ملاقات شباہت سے ہوتی ہے اور یوں ایک ساٹھ برس کے بوڑھے تخلیق کار کی زندگی میں از سرِ نو بہار آتی ہے۔ کینیڈا میں قیام کے دوران وہ اپنا تیسرا ناول لکھتا ہے اور اس کے لیے "سپیروز آر ڈیڈ"(Sparrows Are Dead) کا عنوان تجویز کرتا ہے۔ اس کے ناول کا یہ عنوان افغانستان میں معصوم بچوں کے جانی ضیاع کی عکاسی کرتا ہے۔

انعام اللہ ناول کے آخری حصے میں احساسِ جرم میں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ہر جان کے ضیاع کی خبر پر وہ اپنی عزتِ نفس کے مجروح ہونے کے احساس سے دوچار ہوتا ہے اور خودکشی کا خیال اس کے دل میں پرورش پانے لگتا ہے۔ وہ اپنے ناکارہ وجود کو ختم کر دینا چاہتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ تخلیق کار کی تخلیق کسی جان کا مداوا نہیں ہو سکتی، کسی مظلوم کی فریاد نہیں بن سکتی۔ انعام اللہ ادب کو ایک انٹلیکچوئل۔۔۔ قرار دیتا ہے:

> "یہ بھی محض خام خیالیاں ہیں شباہت کہ ادب ظلم کا راستہ روک سکتا ہے۔۔۔ لکھے گئے حرف میں سے انصاف کے چشمے پھوٹ سکتے ہیں۔۔۔ نہیں ادب بھی خود کو بری الزمہ قرار دینے کی ایک انٹلیکچوئیل۔۔۔ ہے۔۔ جس سے فارغ ہو کر آپ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔۔۔ اور یہی تو وہ چاہتے ہیں کہ ہم اس نوعیت کی ماسٹر بیشن میں

مشغول رہیں ، ناول تحریر کریں ، مزاحمتی ادب تخلیق کریں ، رُلا دینے والے مرثیے لکھیں۔"(4)

ناول بعض اوقات کسی ایک کردار کا مکالمہ مصنف کا نظریہ بن کر سامنے آتا ہے۔ وہ اس ایک کردار کے ذریعے اپنے نقطہ نظر کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ انعام اللہ کے بطور ادیب کردار میں مصنف کی اپنی شخصیت کا ادبی پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنی ذاتی زندگی میں جنگ و جدل اور فسادات کی تباہی و بربادی سے رنجیدہ ہوتے ہیں۔ ملکی حالات پر ان کی مایوسی اور غم و غصہ ان کے ساتھ کیے گئے مکالموں اور انٹرویوز میں سامنے آتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے عہد کی حشر سامانیوں اور جنرل ضیاء سے نفرت کا بلند بانگ اعلان کرتے ہیں۔ ناول میں ضیاء الحق کے دورِ آمریت میں انعام اللہ پر کیا جانے والا تشدد دراصل مصنف کی ضیاء الحق سے نفرت کا واضح بیان ہے۔ انعام اللہ ایک جرات مند ادیب اور زندگی کے بیش بہا تجربوں سے بھرپور کردار ہے جس کی شخصیت کی بلندی ناول میں نمایاں ہے۔ ساٹھ برس سے تجاوز اس بوڑھے ادیب انعام اللہ کو جب نوجوان عورت شباہت کی دوشیزگی ، جنسی اختلاط ، محبت اور بے لوث خدمات میسر ہوتی ہیں تو وہ اپنی مجروح شدہ عزتِ نفس کے سارے زخم مندمل ہوتے محسوس کرتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی شباہت اور اپنی تخلیقات کے لیے وقف کر دیتا ہے۔

اکبر جہان بھی ایک مہاجر بدیسی کردار ہے جو اپنی ماں کی نصیحت پر بہتر مستقبل کی تلاش میں کینیڈا میں مقیم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک متحرک اور مکمل کردار ہے۔ مضبوط اعصاب ، پختہ ارادوں اور مستقل جدوجہد جیسے اوصاف کا حامل یہ کردار ناول میں دیگر کرداروں کی طرح اپنے حصے کی شمع اس قدر روشن کر دیتا ہے کہ اس کے اجالے میں قاری اس کردار کی انفرادیت کا قائل ہو جاتا ہے اور اس کے جرات آزما طویل سفر کی داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ناول میں کرداروں کی تشکیل اور پھر ان کا سفر ایک کٹھن کام ہے جو ناول نگار سے خونِ جگر مانگتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے یہ کردار تخلیق کرنے میں بھی بڑے جتن سے کام لیا ہے۔ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا جذبہ ، بیگانے ملک میں قدر ناشناسی ، ہجرت کا کرب اور نسلی تفاخر اس کردار کی تین نمایاں خصوصیات ہیں۔ کینیڈا میں پانچ سال روزگار کی تلاش میں مارا مارا پھرتے اکبر جہان پر بالآخر قسمت کی دیوی مہربان ہوتی ہے اور کینیڈا کے ایک غیر آباد علاقے کو آباد کرنے کے لیے دس مربع میل علاقے کے کاغذات اس کے نام کر دیئے جاتے ہیں۔ جنگل کے کنارے ایک غیر آباد علاقے میں پہلا جھونپڑا اکبر جہان کا ہوتا ہے۔ کئی برسوں پر محیط طویل جدوجہد کے بعد وہ اس علاقے کو آباد کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس علاقے کا نام "جہان آباد" رکھتا ہے۔ اور پھر اپنے ملک پاکستان ، بنگلہ دیش اور سری لنکا کے مزدوروں کو بلا کر انھیں آباد کرتا ہے۔ یہ کردار معاشرے کے ایک ایسے فرد کی عکاسی کرتا ہے جس کے اندر اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا جذبہ ہے۔ ایک تنہا ملاح کی طرح ایک ویران علاقے میں زندگی بسر کرنا جس جرات اور حوصلہ مندی کا تقاضا کرتا وہ اکبر جہاں میں

کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ چینی خاتون وانگ لی سوئی اور اور نشاط خاتون اس کی بیویاں بنتی ہیں۔ وانگ لی سوئی سے بیٹا رچرڈ جہان اور نشاط خاتون سے بیٹا بخت جہان اور بیٹی سیرت جہان جنم لیتے ہیں۔ اکبر جہان کی دونوں بیویاں اس علاقے کے موسم سرما کی شدت کی تاب نہ لاتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ اکبر جہان ایک ایسا کردار ہے جسے پرائے ملک میں قیام کے دوران اپنے وطن کی یاد ستاتی ہے۔ وہ اپنے وطن میں گزرے ماہ و سال اور سچی رفاقتیں یاد کرتے ہوئے شدید اذیت کا سامنا کرتا ہے۔ ہجرت کا کرب اس کی نس نس میں بھرا ہے۔

"مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کوئی تمہارے دکھ میں شریک نہیں ہوتا۔ تم کسی کے آگے اپنا کلیجہ کھول کر اس پر لگا گھاؤ نہیں دکھا سکتے کہ کوئی اس پر پھاہا ہی رکھ دے۔۔۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ اکبر جہان کل تو تمہارے چہرے پر اتنی شکنیں نہ تھیں آج اگر تمہارے چہرے پر شکنوں کی چلمن نظر آ رہی ہے تو کیا ہوا۔۔۔۔ کوئی ایک شخص جو میرے دکھڑے سن لے جو میرے زخموں پر اور کچھ نہ سہی ایک گرم پھونک مار کر ان کی اذیت قدرے کم کر دے میں اسے خریدنے کی سکت نہیں رکھتا کہ دکھ کی شراکت کے لیے عزیز داری اور دوستی درکار ہے دولت نہیں۔"(5)

اکبر جہان غیر ملک میں بسنے والے معاشرے کے ان حقیقی کرداروں کی نمائندگی کرتا ہے جن کے پاس دھن دولت کی تو افراط ہے مگر ان کے پاس کوئی ایک ایسا فرد نہیں جسے وہ دکھ کی گھڑی گلے لگا سکے؛ جو غم میں ان کی ڈھارس بندھا سکے۔

اکبر جہان کے کردار کا تیسرا اہم پہلو اس کا نسلی تفاخر ہے۔ اس کا تعلق جاٹ برادری سے ہے اور جاٹ خاندان زمین کے ایک ٹکڑے پر جان دینے سے گریز نہیں کرتے۔ جاٹ خاندان کا یہی تفاخر اس کی سرشت میں شامل ہے۔ اکبر جہان کا یہ نسلی تفاخر اس کی بیٹی سیرت جہان اور پرکاش سنگھ کی محبت میں رکاوٹ بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اکبر جہان کسی صورت بھی یہ قبول نہیں کرنا چاہتا کہ جاٹ خاندان کی بیٹی کسی سکھ مذہب کے انسان سے بیاہ دی جائے۔ اکبر جہان کا بیٹا بخت جہان جب سرو سانسی کی پوتی شباہت سے شادی کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو یہ خاندانی برتری کا احساس اس کے اندر شدت سے پھوٹتا ہے اور کسی سانسی کی بیٹی کو اپنی بہو بنانا وہ اپنی عزت نفس کا قتل سمجھتا ہے۔ اپنی بیٹی کا سکھ جوان کے ساتھ شادی کرنے (جو شادی سے قبل اسلام قبول کر لیتا ہے) اور بیٹے کا ایک سانسی کی پوتی سے شادی کی خواہش سن کر اس کی عزتِ نفس مجروح ہو جاتی ہے۔ ندامت کے گہرے احساس میں وہ اپنے فارم ہاؤس کے قریب گدلے جوہڑ کے پانی میں خود کو گرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے۔

موتی سرو سانسی اور سوہنی سانسن کا بیٹا ہے۔ جس نے دیال سنگھ کالج لاہور سے معاشیات میں ایم۔ اے کیا ہے۔ اس کا باپ سانسی ہے۔ اگرچہ اب وہ لاہور میں نمائندہ کاروباری شخصیات میں شمار ہوتا ہے لیکن اب بھی وہ اپنی سانسی خصلت سے باز نہیں آیا۔ اب بھی اسے مردار کھانے کا شوق اتنا ہی ستاتا ہے جتنا کبھی سانسیوں کی بستی میں ستاتا تھا۔ موتی ایم۔ اے کرنے کے بعد اپنے باپ کے اصرار کے باوجود اس کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونے سے انکار کر دیتا ہے کہ اس کا باپ بھری محفل میں اپنے سانسی ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ موتی اپنے بھائی موجو کی طرح اس معاشرت میں عزت نفس کا طلب گار ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے سانسی سمجھ کر حقارت سے نہیں بلکہ انسان سمجھ کر احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مختلف جگہوں پر انٹرویو دیتا ہے لیکن اس کا سانسی ہونا آڑے آجاتا ہے اگر کبھی مذہب کے خانے میں "لامذہب" درج کروائے تو پھر اس کے نتائج کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ موتی اپنے سانسی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ احساسِ محرومی محسوس کرتا۔ مسلسل بیکاری اور احساسِ کمتری کی وجہ سے موتی ترکِ وطن کا فیصلہ کر کے کینیڈا منتقل ہو جاتا ہے۔

کینیڈا میں موتی کو جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے نگہبان کے فرائض سونپے جاتے ہیں۔ موتی تقریباً ڈیڑھ برس تک فرض شناس اور مثالی وارڈن کے فرائض سر انجام دیتا ہے۔ کوہ نوردوں اور پکنک منانے والوں کی راہ نمائی کرتا، ان کے لیے رستے واضح کرتے ہوئے انھیں جنگلی جانوروں سے محتاط رہنے کے لیے آگاہ کرتا ہے لیکن ایک روز وہ اپنی جبلتوں کے آگے زیر ہو جاتا ہے۔ اس کردار کے اپنی سانسی جبلت سے مغلوب ہونے کے عمل کو مستنصر حسین تارڑ یوں بیان کرتے ہیں:

> "یہ لومڑی۔۔ جو ابھی ابھی اسے جنگل کے اندھیر پن میں داخل ہوتی دکھائی دی تھی اِس نے اُس کی ان حسیات کو بیدار کر دیا جنھیں وہ تہذیب کے کفن میں اپنے تئیں روپوش کر چکا تھا۔۔ اس نے بڑے اہتمام سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے آپ کو باپ کی خصلت سے جدا کر کے اس کفن کا تانا بانا بنا تھا جس میں لپٹ کر وہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اس نے اپنی آبائی جبلت کو رخصت کر دیا تھا پر اس لمحے۔۔۔ اس کا سانسی پن یوں بیدار ہوا کہ وہ بے اختیار ہو گیا۔۔۔ وہ اپنا راستہ ترک کر کے جنگل کے اس اندھیر پن میں اس کی مہک کا پیچھا کرتا گیا ۔۔۔ اور بالآخر جب وہ بے خبر چلی جاتی تھی اسے دبوچ لیا۔"(6)

درج بالا اقتباس ناول کے کردار موتی کی جبلت کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ موتی معاشرے میں موجود ایک ایسے کردار کی عکاسی کرتا ہے جو اپنی جبلت سے مقابلہ کر کے ایک دفعہ انھیں زیر تو کر لیتا ہے لیکن یہ کبھی نہ کبھی پھر اس کے ارادے پر غالب آجاتی ہیں۔

موتی اپنی عمر کے آخری حصے میں الزائیمر جیسی مرض کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر اسے اپنے روزمرہ کے معمولات بھی یاد نہیں رہتے۔ وہ ٹوتھ پیسٹ کرتے ہوئے بھول جاتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اپنے سگے رشتہ داروں کے چہرے بھی اسے یاد نہیں رہتے۔ اس کے دماغ کے خلیے مردہ ہوتے رہتے ہیں۔ موتی وہیل چیئر پر بیٹھا ایک ایسا شخص ہے جو اپنے رشتوں کو یاد نہیں رکھ سکتا لیکن اپنی مٹی سے محبت اتنی ہے کہ اس کے وجود کا لازمی حصہ بن کر رہ گئی ہے جسے الزائیمر جیسی مرض بھی نہیں مٹا سکتی۔ موتی کو جھیل کے گدلے پانیوں کو سونگھنے سے اپنی مٹی کی خوشبو یاد آتی ہے اور وہ اپنے ماضی کے ان دنوں کو یاد کرتا ہے جب وہ اور اس کا بھائی موجو دنیا پور کے گدلے پانیوں کے جوہڑ میں مینڈک پکڑا کرتے تھے۔ موتی مشرقی معاشرے کے روایتی نسل پرست باپ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگرچہ اس کے مزاج میں نسلی تفاخر اور غرور ہے تاہم بطور باپ، شباہت کے لیے اس کی محبت دیدنی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو کسی سکھ مذہب کے نوجوان سے شادی کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ اپنی بیٹی شباہت کا شادی کے عین موقع پر فرار ہو جانا اس کی عزتِ نفس کو اس قدر مجروح کرتا ہے کہ وہ بھی اکبر جہاں کی طرح اپنے آپ کو جھیل کے پانیوں کے حوالے کر کے اپنے جسم کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔

روشن امیر بخش کا بیٹا ہے جو کینیڈا میں مقیم ہے۔ انعام اللہ کی طرح روشن کے بھی سیاسی، سماجی اور مذہبی نظریات امیر بخش کے نظریات کی توسیع ہیں۔ اس کردار کے ماضی پر نظر ڈالی جائے اور ہجرت کی وجوہات معلوم کی جائیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ روشن اپنے نظریات کے بے باک اعلان اور آمریت کے خلاف مزاحمتی بیانیہ اختیار کرنے کی بنیاد پر شاہی قلعہ لاہور کے زنداں میں ایک سال قید رہتا ہے۔ آمریت کے دور میں ضیاء الحق کو "مردہ مینڈک ایسی آنکھوں والا" کہہ کر آمرانہ عتاب اپنے سر لیتا ہے۔ فوجی عدالت روشن کو اسلام سے روگردانی کے جرم میں ایک برس قید کی سزا سناتی ہے۔ قید سے آزادی کے بعد روشن اس وسیع کاروبار کے نظم و نسق کو سنبھالتا ہے جس کی بنیاد اس کے باپ امیر بخش، عزیز جہان اور سروسانسی نے رکھی تھی تاہم اس کا زیادہ رجحان صحافت کے میدان میں رہا۔

روشن ایک جاندار کردار ہے جو وقت اور ماحول کے ساتھ اپنی زندگی کی تبدیلی کے فیصلے کرتا رہتا ہے۔ کرداروں کے وقت اور حالات کے ساتھ تبدیلی کے رویئے کے متعلق ڈاکٹر نجم الہدیٰ لکھتے ہیں:

> "جبلتوں، خصلتوں، جذبوں، رجحانوں، رویوں، طور طریقوں، مفاہمتوں اور تصادموں کا یہ مجموعہ جسے شخصیت یا کردار کہتے ہیں، مختلف حالات میں مختلف صورتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کی بلندی، اس کی پستی، اس کا ثبات اس کا تضاد، غرض کہ اس کا ہر رنگ اور ہر پہلو مطالعہ کے قابل ہے۔"(7)

وہ ایک محنت پسند خرد مند کی طرح مثبت رویئے، منطقی استدلال اور مستقل مزاجی جیسی خصوصیات کا حامل شخص ہے۔ روشن ایک معمولی کاروباری آدمی لیکن ایک جرت مند صحافی ہے جو کائنات کی سچائیوں اور طے شدہ حقیقتوں کو ایک کھیل تصور کرتا ہے۔

"۔۔۔ اس بے وجہ تخلیق کی گئی دنیا میں جتنی بھی سچائیاں اور آسمانی عقیدے اور طے شدہ حقیقتیں ہیں وہ سب کے سب کھڈونے ہیں۔۔۔ بھُربھری چینی کے خوش رنگ کھلونے ہیں ۔۔۔ ان کی کاملیت اور شکل وشباہت میں کچھ شک نہیں پر جان لو کہ یہ کھلونے پرندے نہ پرواز کر سکتے ہیں اور نہ ہی یہ پھل ایسے ہیں کہ ان میں جنت کے ذائقے ہیں۔ چینی کے یہ کھلونے استغراق اور منطق کے پانیوں میں پل دو پل میں گھل جاتے ہیں۔"(8)

روشن معاصر عہد کا تہذیبی، سیاسی و سماجی شعور رکھنے والا کردار ہے جو زندگی کے ہر رنگ سے واقف ہے وہ اپنے برسوں کے تجربے کی گہرائی کی بنیاد پر گفتگو کرتا ہے اور یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ تجزیہ غلط ہو سکتا ہے البتہ تجربے کے غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ وہ اپنے ماضی کے ٹھوس تجربات کی روشنی میں زندگی کے مختلف گوشوں پر بڑی سنجیدگی اور استدلال کے ساتھ بات کرتا ہے۔ روشن کے نزدیک زندگی کے نظریات اور طے شدہ حقائق محض پانی کا بلبلہ اور سراب ہیں جن کے قریب جانے سے ان کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

امریکی شہر نیویارک میں مقیم پروفیسر منظور ناظر ایک ثانوی کردار ہے۔ ماضی میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے شعبہ فلسفہ میں بطور پروفیسر اپنی خدمات سر انجام دینے والا ایک ایسا کردار ہے جو اپنی تاریخی منطق اور گہری دانش کی وجہ سے طلبہ میں مقبول ہوتا ہے۔ جسمانی طور پر ایک ٹانگ سے معذور ہے تاہم انقلاب پسند طلبہ اسے اپنا مرشد وراہ نما تسلیم کرتے ہیں۔ پروفیسر ہونے کے ناطے یہ ایک وسیع المطالعہ شخص ہے جس نے کارل مارکس، اینگلز، لینن، ٹراٹسکی کے درجنوں جلدوں پر محیط مجموعے پڑھ رکھے تھے۔ اسے فرانز فینن کی " افتادگانِ خاک " سے گہری وابستگی تھی۔ منظور ناظر بنیادی طور پر کمیونسٹ کے عقیدے سے جڑا شخص تھا۔ وہ پاکستانی معاشرے میں انقلاب کا خواہاں شخص تھا لیکن ملکی حالات سے مایوس ہو کر امریکہ پناہ گزیں ہو جاتا ہے اور امریکی سرمایہ دارانہ نظام کو گلے لگالیتا ہے۔ منظور ناظر پاکستان سے آنے والے انعام اللہ کو پناہ دیتا ہے۔ اس کے استفسار پر اپنی کمزوری اور اپنے ملک میں ہونے والے تشدد کے خوف کا برملا اعتراف کرتا ہے:

"میں نے کیوں اس سرمایہ دارانہ نظام کے تحت زندگی گزارنے کو قبول کیا۔ اس لیے کہ میں ایک کمزور شخص تھا۔۔ انقلاب برپا کرنے کے لیے مسلح جدوجہد کا پرچارک تو تھا لیکن میں کبھی بندوق تھام کر اپنے مقصد کے حصول کے لیے میدان میں نہیں اتر سکتا تھا۔ میرا

ذہن ہر نوعیت کے دباؤ کو سہہ سکتا تھا لیکن میرا بدن اس پہلے درّے کی زد سے تھوڑا سا ادھڑا تو مجھ میں اس اذیت کو برداشت کرنے کی سکت نہ تھی۔۔۔ تمہیں نہیں معلوم کہ جب ایک سوچنے سمجھنے والے بہتر مستقبل کے خواب دیکھنے والے یونی ورسٹی میں لیکچر دینے والے کی پشت پر درّے برستے ہیں تو اس پر کیا گزرتی ہے۔ وہ فوراً ایک معافی نامے پر دستخط ثبت کر کے شکاری کتوں کے جبڑوں سے نکل جاتا ہے۔"(9)

مندرجہ بالا اقتباس پروفیسر منظور ناظر کا ایک مکالمہ ہے جو اس کردار کی نفسیات کو بخوبی بیان کرتے ہوئے ہمارے معاشرے میں آمریت کے دور میں ہونے والے مظالم کی داستان کو بھی سمیٹ رہا ہے۔ پروفیسر منظور ناظر اس بات کا برملا اعتراف کرتا ہے کہ اس کے اپنے وطن کے باشندے اسے لنگڑا پروفیسر کہہ کر پکارتے تھے جب کہ امریکہ کے اس سرمایہ دارانہ نظام میں عوامی جگہوں پر اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ اسے عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ماضی میں پنجاب یونی ورسٹی میں شعبہ فلسفہ کا پروفیسر اپنے ملک میں ہونے والی آمریت سے مایوس ہو کر نیویارک کے شہر میں گروسٹری سٹور چلاتا ہے۔ اس کردار کا یہ غیر متوقع پن قاری کے لیے چونکا دینے والا ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص مایوسی کی اس حد تک جا سکتا ہے کہ وہ اپنے خوابوں سے کنارہ کر لے۔ پروفیسر منظور ناظر معاصر تاریخ کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ وہ عصر حاضر میں ہونے والی تمام جنگیں اور دیگر حالات کا گہرا ادراک رکھتا ہے تاہم وہ اس قدر مایوس ہو چکا ہے کہ اب انقلاب کا خواب دیکھنا ترک کر چکا ہے۔ اس کے نزدیک اب صرف زندگی اور رزق اہم چیزیں ہیں۔ نظریات اس کے نزدیک اتنے اہم نہیں رہے جتنا ماضی میں تھے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس کردار کی تشکیل اور اس کے سفر میں بڑی بالغ نظری سے کام لیا ہے۔ پروفیسر منظور ناظر انعام اللہ سے مخاطب ہوتے ہوئے اسے یہ اعتراف کرتا ہے امریکی معاشرے نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اسے اس سرمایہ دارانہ معاشرے میں عزت کی زندگی گزارنے کی آزادی ملی ہے۔ اسے اس ملک میں کبھی معذور سمجھ کر حقارت آمیز رویہ نہیں اپنایا گیا۔ امریکی معاشرے میں اسے اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا تخلیق کردہ یہ متنوع جہات کا حامل کردار اپنے ہر عمل پر قارئین کو چونکا دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس ناول میں معاشرے میں موجود ان حقیقی لوگوں کی نمائندگی کی گئی ہے جو اپنے وطن میں حق گوئی و بے باکی کی اس قدر سزا پاتے ہیں کہ بالآخر خود غرضی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کمیونسٹ عقیدے سے جڑا ایک وسیع المطالعہ اور تجربہ کار پروفیسر جو کسی وقت میں انقلاب پسند طلبہ کا مرشد و راہ نما رہا ہے آج اس قدر خود غرض ہو گیا ہے کہ دوسروں کو بھی رزق دینے والے ملک امریکہ کی قدر کرنے کی نصیحت کرتا ہے۔ منظور ناظر کا کردار انقلاب کے

خواب دیکھنے والے اس شخص کا کردار ہے جو حالات کی ستم ظریفی کے باعث محض اپنے اور اپنے خاندان کے پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لیے اپنی زندگی تج دیتا ہے۔ یہ کردار انقلاب کے خواب دیکھنے والے ایسے ہزاروں افراد کی نمائندگی کرتا ہے جو یا تو منوں مٹی تلے دب چکے ہیں اور یا ناقدر شناس پاکستانی معاشرے سے ہجرت کر چکے ہیں۔

بخت جہان (جونیئر) اکبر جہان کا بیٹا ہے جس کا نام اس کے دادا بخت جہان کے نام پر رکھا گیا۔ بخت جہان (جونیئر) کی ذات میں اس کے دادا کی صفات ہیں۔ وہ ایک متکبر، مغرور اور انا پرست آدمی ہے جس کے اندر موقع بہ موقع بے وجہ اشتعال پیدا ہوتا رہتا ہے۔ بخت جہان کے اندر بھی وہی خاصیتیں ہیں جو اس کے دادا بخت جہان میں تھیں۔ وہ ایڈمنٹن یونیورسٹی سے زراعتی انجینئرنگ اور ٹورنٹو یونیورسٹی سے زراعت اور مارکیٹنگ کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ بخت جہان کینیڈا میں پیدا ہوتا ہے تاہم اس کے اندر ایک ناسٹلجیائی طبیعت کا شخص ہے جسے اپنے باپ اور دادا کی یاد کے ساتھ اپنے آبائی علاقے کی زمینوں کی یاد ستاتی ہے۔ یوں بدیسی بیزاری اور پردیس میں اجنبیت کا احساس اس کی زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے۔ بخت جہان کے اندر ایک مردانہ آوارگی اور جوش ہے جو اسے بیابان اور جنگل میں سکون فراہم کرتا ہے لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ ماحول کے مطابق اپنی شخصیت کو ڈھال لیتا ہے۔ جنگلات میں رہتے ہوئے وہ ایک آوارہ گرد اور خانہ بدوش کی طرح زندگی گزارتا ہے جبکہ شہر میں رہتے ہوئے ایک مہذب شخص کے کردار میں ڈھلتے ہوئے اسے دیر نہیں لگتی۔ ماضی کی یادوں میں خود کلامی کرنا اس کردار کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ تہذیب سے کٹے ہوئے اور تنہائی میں رہنے والے اس کردار کی خود کلامی میں ماضی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ بخت جہان کے اندر ہمیشہ یہ وہم رہتا کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔ ریستوران یا شراب خانے میں بیٹھے ہوئے اور سڑک پر چلتے ہوئے اسے ہمیشہ یہی گمان ہوتا ہے کہ ارد گرد کے لوگوں کی توجہ اس کی طرف مرکوز ہے۔ بخت جہان ایک دراز قامت، تیکھی ناک، نیم سنہری بال اور گردن میں نامعلوم سا خم رکھنے والا ایسا جوان ہے جس کے اندر اپنے دادا کی خصلتیں ہیں۔ اپنے دادا کی طرح بخت جہان بھی ہر شے کو حقیر سمجھتا ہے۔ آئرش میگی مارگریٹ، ہسپانوی ازابیلا اور سر لنکن رانا چندا جیسی تین خواتین اس کی زندگی میں آئیں لیکن اس کی تنہائی کا مستقل سہارا نہ بن سکیں۔ بعد ازاں بخت جہان، موتی کی بیٹی شباہت سے محبت کا اظہار کرتا ہے بخت جہان کے اندر چاہے جانے کی آرزو اس قدر شدت سے پھوٹتی ہے کہ وہ اپنے غرور و تکبر اور نسلی تفاخر کو پس پشت ڈال کر شباہت کے گھر جا کر اس سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے دل کی دنیا کو شباہت کی محبت سے آباد کرنا چاہتا ہے، اسے حاصل کرنے کے لیے اپنا غرور اور تکبر ختم کر دیتا ہے۔ اس کے لیے کئی جتن کرتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند تو ہو جاتی ہے تاہم عین شادی کے موقع پر شباہت اس کی زندگی سے بہت دور نکل جاتی ہے۔ بخت جہان ایک ایسا کردار ہے جو اپنی جڑوں، اپنے آبائی وطن کو

لوٹ جانا چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس پرائی زمین نے اسے گلے نہیں لگایا۔ وہ اپنی ہی سرزمین کو اپنی پہچان سمجھتا ہے۔ بخت جہان ماضی میں کی گئی اپنے باپ کی نصیحت کو ان الفاظ میں دھراتا ہے:

"ہم نے اگرچہ یہاں اس مہربان سرزمین جڑیں پکڑلی ہیں پر ان جڑوں کے ساتھ ابھی تک ہماری اپنی مٹی کے ذرے چمٹے ہوئے ہیں اور وہی ہمارا اصل اور ہماری پہچان ہیں۔۔۔ اپنی جڑوں سے پیوستہ اس مٹی کے ذروں کو کبھی فراموش نہ کرنا۔۔ تم ابھی نہیں سمجھ سکتے لیکن جب آئیندہ زمانوں میں تمہیں ادراک ہو گا تو کبھی بے شک چند ساعتوں کے لیے ہی سہی اس مٹی کی جانب لوٹ جانا۔۔۔ رچرڈ میں ان آئیندہ زمانوں میں ہوں۔۔۔ میں وہاں ٹھہروں گا نہیں۔۔۔ لوٹ آؤں گا۔"(10)

بدیسی بیزاری اور زمینی جڑت کا احساس اس کی شخصیت کا ایک مضبوط حصہ بن کر ظہور پذیر ہوتا ہے۔

بخت جہان (جونیئر) کینیڈا کی تنہائی اور بیگانگی سے اس قدر دلبرداشتہ ہوتا ہے کہ اپنی آبائی زمین یزمان کی طرف لوٹ جاتا ہے جہاں وہ سب سے پہلے اپنے دادا بخت جہان کی قبر پر جاتا ہے۔ یہاں وہ بالکل معاشرتی اور زمینی کردار کے روپ میں منظر پر آتا ہے۔ جب بخت جہان اپنے آبائی گھر قدم رکھتا ہے تو اس کی سوتن ماں امرت کور اسے اپنا بیٹا گوبند سمجھ کو پیار کرتی ہے جو جنگ پر جاتا ہے مگر لوٹ کر نہیں آتا۔ بخت جہان حیرانی میں اسے انکار کر دیتا ہے کہ وہ اس کا بیٹا نہیں بلکہ بھاگ بھری کا بیٹا ہے۔ اپنی آبائی زمین کو لوٹ جانے کے بعد بخت جہان کا غرور اور تکبر پھر واپس آجاتا ہے اور وہ ہو بہو اپنے دادا کی مثال بن جاتا ہے۔ بخت جہان کا کردار ایک دائروی کردار ہے جو بیگانے ملک میں ایک زندگی گزارنے کے بعد اپنے وطن کی سرزمین کو لوٹ جاتا ہے۔ اپنے رشتوں کو گلے لگاتا ہے اور اپنی زمین کے چپے چپے سے محبت کرتا ہے۔

رچرڈ جہان بخت جہان اور وانگ لی سوئی کا بیٹا ہے جس کے چہرے پر چینیوں کا چٹپٹا پن اور مختصر آنکھیں سجی ہیں۔ رچرڈ ایک موقع شناس اور زمانہ ساز کردار ہے جو موقع بہ موقع اپنے آپ کو مختلف روپ اور رویوں میں ڈھال لیتا ہے۔ جب کبھی وہ جنگلات میں زندگی بسر کرتا ہے تو ایک آوارہ گرد خانہ بدوش کی طرح رہتا ہے مگر جب کبھی شہر میں آتا ہے تو جنگل کے باسی سے تہذیب یافتہ شہری بنتے اسے دیر نہیں لگتی۔ اگرچہ اس کی رگوں میں چینی خون ہے لیکن اکبر جہان کا بیٹا ہونے کے ناطے اس کے مزاج میں بھی وہی تکبر، نسلی تفاخر اور احساس برتری شامل ہے۔ بخت جہان اپنی مجرد زندگی سے بالکل مطمئن ہے۔ رچرڈ جہان کا کردار ایک ضمنی کردار ہے جو بخت جہان کے کردار کی تکمیل اور اس کے مقاصد واضح کرنے کی مد میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔ شباہت کے ٹھکرا دینے پر جب بخت جہان اپنی زمینوں کو واپس لوٹ جانے کا

عندیہ دیتا ہے تو رچرڈ جہان ایک بڑے بھائی کی طرح اسے سمجھاتا ہے اور یزمان جانے کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے اسے کینیڈا میں ہی رہنے کی نصیحت کرتا ہے:

> " بختی تمہیں گزند پہنچ سکتی ہے۔ وہ ملک ایسا نہیں ہے جو ہوش میں ہو۔۔ خودکشی پر مائل اپنے آپ کو بخوشی ہلاک کر ڈالنے کی سر توڑ کوشش میں مشغول، جہاں قدم رکھنا اپنی جان کو داؤ پر لگانے کے مترادف ہے۔۔۔ بہت شورش ہے۔۔۔ کوئی بلوچستان ہے کہیں کوئی وزیرستان ہے اور وہاں خانہ جنگی کے آثار ہیں۔ القاعدہ اور طالبان راج کرتے ہیں۔۔۔ اور ایک کمانڈو ہے جو آئے دن ٹیلی ویژن پر نہایت بے حسی سے جلتے ہوئے روم میں بانسری بجاتا نظر آتا ہے۔ تم ایک ایسے اجتماعی اور پر تقدس خودکشی کرتے ہوئے ملک میں صرف اس لیے جانے کا ارادہ رکھتے ہو کہ وہاں کسی گاڈ فار سیکن گاؤں میں زمین کے چند ایکڑ ہمارے نام نکل آئے ہیں۔۔۔ اس لیے اپنی جان کو داؤ پر لگانا چاہتے ہو۔ "(11)

کردار چونکہ مصنف کے تخلیق کردہ ہوتے ہیں۔ مصنف اپنے نقطہ نظر کا بیان اپنے کرداروں کی زبانی کرتا ہے۔ درج بالا اقتباس مصنف کے نظریہ کی بھی کامیاب عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ رچرڈ اگرچہ اکبر جہان کا بیٹا ہے تاہم اس کی ماں ایک چینی خاتون ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بخت جہان کی طرح اپنی آبائی زمین سے قلبی وابستگی نہیں رکھتا۔

نسوانی کرداروں میں شباہت سب سے متحرک، توانا اور مضبوط کردار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ شباہت سانسی نسل کی آخری نشانی ہے جس کے اندر سانسی پن کی وحشت کے ساتھ ایک ٹھہراؤ اور گریز بھی ہے۔ شباہت کے تحت الشعور میں پنہاں حیوانی خصلتیں موقع و محل کے مطابق بیدار ہو جاتی ہیں۔ شباہت موتی کی جواں سال بیٹی ہے جس نے کینیڈا میں پرورش پائی ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت مغربی طرز پر ہوئی ہے۔ قاری کو چونکا دینے کی صلاحیت رکھنے والا یہ کردار مغرب میں رہنے والی جدید معاشرے کی ان عورتوں کا نمائندہ کردار ہے جو کسی بھی قسم کی روایات و اقدار کی پابند ہونے کی بجائے ان سے بغاوت کرتی ہیں اور اپنی زندگی اپنی من مرضی سے گزارتی ہیں۔ سولہ برس کی عمر تک شباہت کینیڈا میں رہنے والے کسی ٹین ایجر کی مانند پاپ میوزک پر رقص کرتی، ہلا گلا کرتی اپنی گفتگو میں نامناسب الفاظ کا استعمال کرنے والی لڑکی تھی لیکن گرمیوں کی چھٹیوں میں پاکستان جا کر اپنے دادا سرو سانسی سے ملنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب آجاتا ہے۔ وہ اپنے دادا کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ اب وہ مغربی موسیقی کی بجائے مہدی حسن، نور جہاں، سلیم رضا اور ریشماں کے گانے پسند کرتی ہے۔ ہاتھی شباہت کی کمزوری ہیں۔ شباہت کو ہاتھیوں سے اس قدر لگاؤ ہے کہ اس کے بیڈ روم کے پردوں، تکیوں، چادروں، تولیوں، ٹیلی ویژن، سائیڈ ٹیبلز، اس کے زیر جامہ پر

حتیٰ کہ اس کے اعضائے جسمانی پر بھی ہاتھی نقش ہے۔ ہاتھیوں سے اس قدر لگاؤ رکھنا در اصل شباہت کا جنس سے رغبت کی طرف رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔

ہاتھیوں سے بے پناہ لگاؤ کے علاوہ شباہت کے کردار کی نمایاں خصوصیات میں پانیوں سے ڈر اور ہر شے کو سونگھنے کا عمل تھا۔ شباہت پانیوں سے اس قدر ڈرتی ہے کہ وہ جھیل کے کنارے کھڑی نہیں ہو سکتی۔ وہ ہر ایک چیز کی خریداری کے وقت پہلے اسے سونگھتی ہے۔ پیزا، پاستا، سبزیاں، سویٹر، کراکری، زیر جامہ اور کتابوں کو سونگھ کے خریدتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ ان لوگوں کی محفل میں رہنا پسند کرتی جن کو سونگھنے کے بعد ان کی بُو اس کے معیار پر پورا اترتی ہو۔ شباہت ایک آزادانہ زندگی بسر کرنے والی عورت کی نمائندگی کرتی ہے۔ شباہت بھی انعام اللہ کی طرح ایک پہلو دار کردار ہے۔ اس کی زندگی کا ایک پہلو اس کے بچپن اور لڑکپن کا دور ہے جس میں اس نے مغربی طرز کی پرورش پائی اور کسی مغربی نوجوان لڑکی اور شباہت میں فرق نہ تھا۔ اس کی زندگی کا دوسرا پہلو اس وقت کھلتا ہے جب وہ پاکستان میں اپنے دادا سرو سانسی سے ملنے جاتی ہے واپسی پر وہ ایک مختلف کردار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اکبر جہان کا بیٹا بخت جہان شباہت کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن شباہت یہ جانتی ہے کہ بخت جہان کا دادا میرے دادا کو کس قدر حقیر سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک نسلی تفاخر اور احساس برتری و کم تری نسل در نسل سفر کرتی ہے۔

> "تم بخت جہان، اکبر جہان کے بیٹے تو ہو پر چوہدری بخت جہان کے پوتے بھی ہو۔۔۔ جو میرے دادا سرو سانسی کی بستی میں کیکر کی شراب حاصل کرنے کے لیے چلا تو جاتا تھا پر اسے چھونے سے گریز کرتا تھا کہ وہ مردار کھانے والا تھا اور نہ ہی اسے اپنے برابر بٹھاتا تھا۔۔ ذات پات کی قید اور بے بسی ہمارے جینز میں نسل در نسل سفر کرتی ہے اور اسے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ کہیں آئیس لینڈ میں ہے، امریکہ میں ہے یا کینیڈا کے شہر کیلگری کے اس پیزا پارلر میں ہے۔"(12)

شباہت کے کردار کا تیسرا پہلو انعام اللہ کے ساتھ محبت میں کھلتا ہے۔ شباہت کے مزاج میں ایسی وحشت ہے جو اس کی جینز کی عطا کردہ ہے۔ عین شادی کے وقت جب اس کے استقبال کی خاطر اس کا ہونے والا شوہر بخت جہان گاڑی کا دروازہ کھولنے لگتا ہے تو شباہت اسی موقع پر فرار ہو جاتی ہے اور ایک ساٹھ برس کے بوڑھے ناول نگار کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ ناول کے اس حصے میں شباہت کا کردار اپنے تمام رشتوں، تمام اقدار و روایات اور اخلاقی ضابطوں سے بغاوت کے روپ میں منظر پر آتا ہے۔ ہر چیز کو سونگھنے کی حس شباہت کی زندگی میں یہ انقلاب آفریں قدم اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بوڑھے ناول نگار انعام اللہ سے مخاطب ہوتے ہوئے شباہت کہتی ہے:

"تم جانتے ہو کہ میں تمہاری جانب کیوں ملتفت ہوئی۔۔ اس لیے کہ مجھے تم سے بُو آتی تھی۔۔ تم مجھے پہلی نظر میں ایک موٹے ریچھ ایک کڈلی گرزلی بَیر لگے تھے۔۔۔ اور تمہیں شاید نہیں پتہ کہ ایک گرزلی کی موجودگی کی بُو بہت دور دور تک جاتی ہے۔۔۔ تم میں سے ایک گرزلی کی بُو آتی تھی جو مجھ سے سنبھالی نہ جاسکتی تھی۔"(13)

عین شادی کے موقع پر انکار کر کے ایک ساٹھ سالہ ناول نگار کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ شباہت کی بغاوت کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ایک انٹرویو میں کرداروں کی بغاوت کے متعلق کہتے ہیں:

"میں ہمیشہ یہ سمجھتا ہوں کہ جو تخلیق کار ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو ایک چھوٹا سا خدا سمجھتے ہیں۔ جس طرح کے لوگ خدا سے باغی ہو جاتے ہیں اس طرح ناول کے کئی کردار ناول نگار سے باغی ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنا رستہ خود بناتے ہیں اور وہاں سے وہ ناول بڑا بنتا ہے۔"(14)

اس کردار کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کردار جب مصنف کے تخیل کے چاک پر ڈھل رہا تھا تو خود مصنف سے باغی ہو گیا۔ شباہت کی زندگی میں ہاتھیوں کے بے پناہ لگاؤ اور چیزوں اور لوگوں کو سونگھنے کی حِس ایک ایسا پہلو ہے جس کی تعبیر اس کی نسل اور خاندان کو مدِ نظر رکھ کر کی جاسکتی ہے۔ اس کردار کے زریعے ہی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خاندانی سفر میں اس نسل کے خصائص کسی بھی فرد میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ شباہت اپنی باتوں سے انعام اللہ کو شادی کرنے پر قائل کر لیتی ہے اور اسے ایک ایسی نئی دنیا بنانے کے خواب میں شریک کرتی ہے جو دنیا ان کی اپنی تخلیق کردہ ہے۔ شباہت جدید معاشرے کی تعلیم یافتہ عورت کا ایسا کردار ہے جو محبت کے جذبے کو باقی تمام جذبات اور عزائم پر غالب سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک محبت کا جذبہ واحد جذبہ ہے جسے اپنا کر انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کی ذلت کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"ازل سے جنگیں ہوتی رہتی ہیں، یہ سلسلے کبھی نہیں رکے پر ان کے ساتھ ساتھ محبت بھی کبھی نہیں رکی اور بالآخر وہ ان پر غالب آجاتی ہے، ہمارا نہ تاریخ پر اور نہ انصاف پر کچھ اختیار ہے۔۔ پر محبت پر تو ہے۔۔ اور ہم اس ہتھیار کو استعمال کر کے اپنے لیے ایک بہتر دنیا تشکیل دے سکتے ہیں۔ یوں اپنے آپ کو فنا کر دینے سے تو کچھ حاصل حصول نہیں۔"(15)

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شباہت ایک ایسا کردار ہے جو انعام اللہ جیسے تجربہ کار ادیب سے زیادہ بہتر طور پر زندگی کی حقیقتوں کو بیان کر سکتی ہے۔ وہ قدیم سانسی دانش کا عکس ہونے کے ساتھ ساتھ معاصر عہد کی زمانہ شناس خاتون ہے۔ شباہت محبت کے جذبے کی راہنمائی میں اپنی نئی کائنات بنانے کی طرف نکلتی ہے۔ وہ اپنی محنت انعام اللہ کے ساتھ اپنے گھر اور شہر سے دور ایسی ویرانیوں میں لے جاتی ہے جہاں صرف اور صرف محبت کا گزر ہو۔ ناول میں

شباہت کا کردار ایک غیر متوقع پن کیفیت کا لطف دیتا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے قاری اس کردار کے متعلق طرح طرح کے جذبات پیدا کر لیتا ہے لیکن ناول کے آخر میں ان سب جذبوں پر کردار سے محبت کا جذبہ حاوی ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرے کے رائج کردہ اصولوں اور اخلاقیات کو خاطر میں لائے بغیر انعام اللہ کو حاصل کرنا چاہتی ہے کیونکہ اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو اسے پسند ہیں۔

"۔۔ اس زمین کو جو تاریکیوں میں ڈوب کر ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جانے کو ہے، ہم اسے پھر سے اپنے بچوں سے آباد کر کے اسی طور روشن کر سکتے ہیں جیسی کہ یہ اس کے فرمان سے روز اول روشن ہوئی تھی کہ اس آبی پردے کے پار بھی تو ہم ہیں جو آخری سچ اور حق ہیں۔۔۔ ہم ہی حق ہیں۔۔ اگر اس نے ہمیں تخلیق کیا ایک بت میں ڈھالا تو اس کمہار کے ہاتھوں کی حدت ہماری مٹی میں بھی تو گندھی ہوئی ہے اور یوں ہم بھی تخلیق پر قادر ہیں۔ اور وہ نئی دنیا جو ہمارے بچوں سے دوبارہ آباد ہو گی اس کا آسمان بھی نیا ہو گا جس پر وہ سب پنکھ پکھیرو پرواز کریں گے جو کبھی درختوں کے نیچے مردہ پڑے تھے اور ہم ان گودوں کو جنھیں سنسان کر دیا گیا ہے پھر سے بھر دیں گے۔"(16)

شباہت کے اس مکالمے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محبت کے گہرے تجربے سے گزری ہے۔ اس مکالمے میں اس کے تجربے کی پختگی اور سچائی واضح طور پر جھلکتی ہے وہ محبت جیسے پاکیزہ جذبے کو دوسرے تمام منفی جذبات پر غالب ہوتا محسوس کرتی ہے۔ شباہت اپنے جسم کی دوشیزگی انعام اللہ کے سپرد کر کے اپنی اور اس کی شخصیت کی تکمیل کرتی ہے۔ وہ دونوں محبت اور زندگی کی حقیقتوں کو پا لیتے ہیں۔ ناول کے آخری حصے میں شباہت کا کردار پر امید اور حوصلہ افزا اور سب سے توانا کردار کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ جو اپنی ایک ایسی دنیا تخلیق کرنے کا خواب دیکھتی ہے جہاں جنگوں سے ماؤں کی گودیں نہ اجڑیں، جہاں دھماکوں سے چہچہاتے پرندے درختوں سے پرواز نہ کر جائیں۔ شباہت کا کردار زندگی سے بھرپور کردار ہے جو ساٹھ سالہ تنہائی پسند اور مایوس ناول نگار کو ایک نئی زندگی جینے کی تمنا میں شریک کرتی ہے۔ شباہت کے کردار کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ کردار نگاری کے فن سے بخوبی آشنا ہیں۔ ڈاکٹر سفیر اعوان ناول نگار کی اس صلاحیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"تارڑ کے پاس کردار نگاری کا فن بھی ہے۔ ان کے کئی کردار ایسے ہیں جو اُردو ادب کے اوراق پر زندگی پانے والے کسی بھی کردار سے بہتر ہیں۔ تارڑ اپنی ادبی تخلیقات کو مختلف رنگوں کے خاکے نہیں بناتے بلکہ Dickens کی روایت میں مجسمہ ساز کی مانند ہر کردار کی چیدہ چیدہ تفصیلات پر کام کرتے ہیں اور وہ آغاز یا انجام انتہائی توجہ سے نبھاتے ہیں۔"(17)

سیرت جہان اکبر جہان اور نشاط خاتون کی بیٹی ہے۔ کینیڈا کے ویران علاقے جسے اکبر جہان نے "جہان آباد" کا نام دیا، سیرت اس علاقے میں اپنی ہم عمر اور ہم جنس رفاقت کے نہ ہونے کی وجہ سے شہر میں رہائش پذیر ہو جاتی ہے۔ وہ وینکوور میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مانٹریال میں اپنا ذاتی فلیٹ خریدتی ہے اور یونیورسٹی میں ایم بی اے کے آخری سال کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ سیرت جہان ایک سکھ لڑکے پرکاش سنگھ سے محبت کرتی ہے اور وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں تاہم اس کے باپ اکبر جہان کا نسلی تفاخر اس محبت کی راہ میں تھوڑی دیر رکاوٹ رہتا ہے۔ سیرت ایک ایسی لڑکی کا کردار ہے جس کے مزاج میں ایک سفاک سرکشی اور باغیانہ لہجہ ہے۔ وہ اپنے باپ کے فیصلوں کو چیلنج کرتی ہے اپنی محبت کے حصول کے لیے باپ کے ساتھ بغاوت کرنے کو ایک معمولی عمل سمجھتی ہے۔ سیرت جہان کا نسائی کردار ایک عورت کے رومانی جذبات اور وفا کا پیکر ہے۔ اس کردار کی وفاداری دیدنی ہے جو اپنی محبت کے حصول کی لگن میں کسی قسم کی قربانی سے گریز نہیں کرتی۔

> "اگر میرا دادا جسے میں نے تو کہاں دیکھنا تھا۔۔۔ آپ نے بھی اسے صرف ایک بار دیکھا تھا۔۔۔ شادی شدہ اور مائنڈ یو اس کے بہترین دوست سے شادی شدہ عورت ۔۔۔ سکھ عورت کو گھر میں ڈال لیتا ہے اس کے ساتھ نکاح کر لیتا ہے۔۔۔ تو میں ۔۔۔ اس کی پوتی ایک اچھے بھلے کنوارے سکھ کے ساتھ شادی کیوں نہیں کر سکتی۔۔۔ یہ تو خاندانی روایت ہے۔"(18)

سیرت جہان کا کردار پوسٹ ماڈرن دور کی ایک ایسی لڑکی کا کردار ہے جو اپنی محبت کے حصول کی خاطر کسی بھی چیز کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتی۔ رشتوں سے بغاوت کرنے اور ناممکن کو ممکن بنانے کے جتن اس کے مزاج کا مستقل حصہ بن جاتا ہے۔ سیرت جہان اپنے بوڑھے باپ کے منع کرنے کے باوجود اس سے یوں مخاطب ہوتی ہے:

> "میں نے پچھلی بار بھی آپ سے کہا تھا کہ میں محض مشرقی مروت کی ماری ہوئی ایک ایسی لڑکی ہوں جو اپنے ڈیڈی سے محبت کرتی ہے ورنہ۔۔۔ میں بالغ ہوں اور اپنے فیصلے خود کر سکتی ہوں۔۔۔ میں تو پارک سے بہر طور شادی کر رہی ہوں۔۔۔ ہو سکتا ہے آپ گرینڈ ڈیڈ بننے والے ہوں۔۔۔ ابھی سے کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا ہو۔۔۔۔ دو ماہ گزر بھی چکے ہوں۔۔"(19)

سیرت جہان اگرچہ خاندانی روایات اور سماجی اقدار سے باغی ہے لیکن وہ زندگی میں مثبت رویے کی قائل ہے۔ وہ محبت کے حصول کی خاطر خاندانی روایات کو توڑ دیتی ہے لیکن یاسیت کسی صورت قبول کرنے کو تیار نہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ زندگی ہمیشہ ایسی مسرتوں سے لبریز رہے جہاں دکھ کا کوئی گزر نہ ہو۔ اس کے نزدیک زندگی کا ہر رنگ خوبصورت ہے۔

جولیا جوائے اور مریم حبیب چوبیس پچیس برس کی عمر کی دو خواتین ہیں جو نیویارک کے بریڈ فورڈ سٹریٹ پر واقع شراب خانے "مچلی" میں انعام اللہ سے متعارف ہوتی ہیں اور اس کی دوست بن جاتی ہیں۔ جولیا خود ساختہ، بے باک، ہنس مکھ اور آزاد مزاج کی حامل ایک بدن فروش لڑکی ہے جس نے انعام اللہ کا ناول پڑھ رکھا ہے اور اس سے بطور مداح ملاقات کرتی ہے۔ جولیا انعام اللہ کی جرات کی داد دیتی ہے۔ مصنف نے اس ناول کے کردار میں اس کی باطنی نفسیات کا بخوبی احاطہ کیا ہے۔ جولیا ایک ایسا کردار ہے جو معاشرے کے ہر دانشور کی کمزوری سے آگاہ ہے وہ ایک طوائف یا بدن فروش ہونے کے ناطے معاشرے میں بسنے والے بظاہر پارسا مگر بباطن رزیلوں کے کرداروں سے بھی خوب آگاہ ہے۔ بدن فروش جولیا اس خوف سے آگاہ ہے کہ اس کا بوڑھا ہوتا جسم جب لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانا ختم کر دے گا تو اس کی زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔

> "میں اس انجام کے سیاہ سائے رینگتے ہوئے اپنے قریب آتے محسوس کرتی ہوں جب پانچ چھ برس کے اندر اندر میں بدنی طور پر ڈھل جاؤں گی اور جنس کے کاروبار کے لیے تقریباً ناکارہ ہو جاؤں گی۔۔ تب میرے حصے میں ایسے بوڑھے آئیں گے جن کے بدن زوال میں ہوں گے اور ان کے گوشت کے مردہ ہونے کی بو برداشت سے باہر ہو گی۔۔۔ کمرے کا کرایہ اور دو وقت کا کھانا بمشکل پورا ہو گا اور تب یا تو میں خودکشی پر مائل ہو جاؤں گی یا پھر ایڈز کا شکار ہو کر بے آسرا اسکڑ سکڑ کر۔۔۔ ایک استعمال شدہ کنڈوم کی مانند مردہ ہو جاؤں گی۔"(20)

جولیا جوائے، مریم حبیب اور ہزارہ کے ساتھ انعام اللہ کی زندگی میں اس وقت آتے ہیں جب اسے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جولیا جوائے اور مریم حبیب ہم جنس پرست، بدن فروش عورتیں ہیں۔ انعام اللہ جب افغان امریکی جنگوں کی ہولناکیوں کی خبریں سن سن کر تنہائی پسند ہو جاتا ہے اور اپنی تخلیقی زندگی ترک کر دیتا ہے تو اس وقت جولیا جوائے اور مریم حبیب ہی اس کا سہارا بنتی ہیں اسے آیندہ زندگی جینے پر اکساتی ہیں۔ ناول میں مصنف نے جولیا جوائے اور مریم حبیب جیسی ہم جنس پرست کرداروں کو ایک ہمدرد اور رحم دل کردار کے روپ میں پیش کر کے یہ واضح کیا ہے کہ معاشرے میں پائے جانے والے ایسے کردار باعثِ نفرت نہیں ہوتے بلکہ ان کے اندر دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ پنہاں ہوتا ہے۔ وجاہت مسعود اپنے مضمون میں معاشرے میں موجود ہم جنس پرست کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہم جنسی رجحانات رکھنے والے افراد کو مجرمانہ میلانات کا حامل سمجھنا غلط ہے۔ اوسط درجے کے انسانوں کی طرح ہم جنس پرستوں کے باہم تعلقات

میں بھی بہت تنوع پایا جاتا ہے۔ یہ لوگ پائیدار تعلقات اور ذمہ دارانہ معاشرتی کردار کے پوری طرح اہل ہیں۔ البتہ سماجی امتیاز، عدم تحفظ اور اخلاقی احتساب کے مسلسل خوف کے باعث ان کے نفسیاتی رویوں میں پیچیدگیاں جنم لے سکتی ہیں جن کا تدارک جسمانی سزاؤں سے نہیں بلکہ انھیں معمول کی زندگی کے مواقع فراہم کرنے سے کیا جاسکتا ہے۔"(21)

مریم حبیب کسی قدر حیادار، دلکش اور ملائمت بھری صورت کی حامل ایسی لڑکی ہے جس کا تعلق البانیہ سے ہے۔ وہ ناول میں جولیا کی ہم جنس پرست دوست کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ مریم حبیب کم گفتار اور کم آمیز لڑکی ہے جس کے بدن فروشی کا کاروبار بھی اس وجہ سے مندا رہتا ہے کہ اس کے اندر جنسی اشتعال کے شعلے کم بھڑکتے ہیں۔ مریم حبیب کے ہر قول اور فعل میں حیاداری کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جولیا جوائے کی طرح زندگی بھر بدن فروشی کی بجائے مریم حبیب ایک عمر رسیدہ البانی کے ساتھ شادی کر کے گھریلو خاتون بن جاتی ہے۔ مقدس بانو سقوط ڈھاکہ میں فسادات کے دوران لوگوں کی جنسی ہوس کا نشانہ بننے والی ایک ایسی عورت ہے جس کے لیے جسم فروشی مستقل پیشہ اور مصیبت بن جاتی ہے۔ تاہم یہ ایک جاندار کردار ہے جو وقت اور حالات کے مطابق ردعمل کرتی ہے۔ مقدس بانو ایک خود مختار عورت ہے جو کیلگری شہر کی ایک عمارت میں اپنی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایک معقول گزارا الاؤنس اور سماجی مدد سے اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ مقدس بانو بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی عورت ہے جس نے اپنے زمانہ طالب علمی میں بنگالی ادب میں ماسٹرز کر رکھا ہے۔ مقدس بانو ایک ماہی گیر کی بیٹی ہے جو صابر و شاکر انسان ہے۔ مقدس بانو کا یہ خواب تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے باپ کی زندگی آسان کرے اور اپنے باپ کے خوابوں کو پورا کرے مگر حالات کی ستم ظریفی نے اس کے حق میں فیصلہ نہ دیا۔ بنگلہ دیش کے فسادات اور قتل و غارت کے دور میں دیگر عورتوں کی طرح مقدس بانو پر بھی ظلم کیا گیا اسے جنسی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ کینیڈا کی حکومت کے توسط سے جب بنگالی یتیم بچے اور حاملہ عورتیں کینیڈا منتقل ہوئیں تو مقدس بانو بھی ان کے ہمراہ کینیڈا منتقل ہوئی۔ جہاں اس کی شادی موتی سے ہوتی ہے۔ مقدس بانو ایک ایماندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس کی تربیت میں مشرقی اور اسلامی اقدار و روایات کی پابندی شامل ہے۔ شادی کی دوسری سالگرہ پر ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کے دوران مقدس بانو کو پتہ چلتا ہے کہ موتی سانسی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اس کے سانسی ہونے کی وجہ سے اس سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ مقدس بانو ایک ایسا کردار ہے جس کے ذہن سے اس کا ماضی محو نہیں ہو پاتا۔ یہ ایک ناسٹلجیائی کردار ہے جس کی گفتگو میں ماضی کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

"میں نے یہ تیس پینتیس برس ان زمانوں کو اپنی یادداشت سے محو کرنے کی کوشش میں گزارے ہیں اور پھر بھی وہ ہر اس منظر پر نقش نظر آتے ہیں جس پر میری آنکھیں ٹھہرتی

ہیں۔۔۔ زندگی کے چہرے مجھے دباتے مجھے بھرتے چلے جاتے ہیں۔ ان برے زمانوں سے
پیشتر میں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں بنگالی ادب میں ماسٹرز کی ڈگری کے حصول کی خاطر دن
رات ایک کرتی تھی۔ کتابوں اور نوٹس کو دیمک کی مانند چاٹتی چلی جاتی تھی۔"(22)

ناول میں مقدس بانو کا کردار مظلوم عورت کے جذبات کا پیکر کردار ہے جس کی زندگی اس کے خوابوں کے ساتھ وفاداری نہ کر سکی۔ اس کردار کا ارتقاء قاری کے لیے حیرانی کا باعث بنتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ناول "خس و خاشاک زمانے" کے تمام بدیسی کردار ایک نئے آدمی کی صورت جنم لے کر مختلف ثقافتی تعاملات اور تہذیبی تصادم کے متنوع رجحانات کو اجاگر کرتے ہیں۔ انعام اللہ، اکبر جہاں، موتی سرو سانسی، روشن، بخت جہاں یہ تمام کردار اپنے زمانوں کے مجروح اور منتشر انسان ہیں۔ جو ہجرت کے بے رحم صدموں، تشخص کی سلگتی رو، تہذیبی تصادم، نسلی تفاخر، سماجی درجہ بندی کا شکنجہ اور سیاسی استحصال میں اپنے ٹکڑے سمیٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر کردار اپنی اصل میں ایک سانحہ اور تہذیبی میراث ہے۔ یہی عناصر ان کرداروں کو انسانی وجود اور وقت کے باہمی ٹکراؤ کی تمثیل بنا دیتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ ان کرداروں کے وسیلے سے سماجی پستی، جنگی جنون اور سیاسی جبر کو یوں بیان کرتے ہیں کہ فرد اور سماج ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی فکری گہرائی اور معنوی وسعت اس ناول کو انسانی تجربے کی مکمل دستاویز بنا دیتی ہے اور اس کے کرداروں کو زمانے کی شکستہ اور خستہ پیشانی پر ثبت ایسی علامتوں میں ڈھال دیتی ہے جو گردش ایام میں بھی مدھم نہیں پڑتیں۔ ان کرداروں کے ظاہری خدوخال اور باطنی پرتوں میں تخلیق کار کی فنی مہارت اور تخلیقی ہنرمندی پوری شان سے جلوہ گر ہے۔ یوں ہر کردار نہ صرف خود ایک مکمل داستان بن جاتا ہے بلکہ مصنف کے جمالیاتی شعور کی عکاسی بھی کرتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

1- منشایاد، خس و خاشاک زمانے پر تبصرہ مشمولہ ماہنامہ الحمراء، لاہور، نومبر 2011ء، ص42

2- مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2017ء، ص471

3- ایضاً، ص582

4- ایضاً، ص686

5- ایضاً، ص519

6- ایضاً، ص521

7- نجم الہدیٰ، ڈاکٹر، کردار اور کردار نگاری، بہار اُردو اکیڈمی، پٹنہ، 1980ء، ص6

8- مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص604

9-ایضاً، ص434

10-ایضاً، ص703

11-ایضاً، ص702

12-ایضاً، ص549

13-ایضاً، ص672

14-مستنصر حسین تارڑ (انٹرویو)، میزبان: اقبال خورشید، اے آر وائی نیوز، 8 فروری 2019ء

15-مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص688

16-ایضاً، ص737

17-سفیر اعوان، خس و خاشاک زمانے: ایک مابعد جدید تجزیہ مشمولہ معیار، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، شمارہ 8، 2012ء، ص404

18-مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص493

19-ایضاً، ص518

20-ایضاً، ص463

21-وجاہت مسعود، کتابی سلسلہ اثبات، مدیر: اشعر نجمی، شمارہ 31 (ہم جنسیت نمبر)، ممبئی، اپریل 2021ء، ص63

22-مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص530

References in Roman Script:

1. Mansha Yad, Review on Khas-o-Khashak Zamany, Monthly Alhamra, Lahore, November 2011, P. 42
2. Mustansar Hussain Tarar, Khas-o-Khashak Zamany, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2017, P. 471
3. Ibid., P. 582
4. Ibid., P. 686
5. Ibid., P. 519
6. Ibid., P. 521
7. Najm-ul-Huda, Dr., Kirdar Aur Kirdar Nigari, Bihar Urdu Acedemy, Patna, 1980, P. 6
8. Mustansar Hussain Tarar, Khas-o-Khashak Zamany, P. 604
9. Ibid., P. 434
10. Ibid., p 703
11. Ibid., P. 702
12. Ibid., P. 549
13. Ibid., P. 672
14. Mustansar Hussain Tarar Interviewed by Iqbal Khursheed, ARY News, February 8, 2019
15. Mustansar Hussain Tarar, Khas-o-Khashak Zamany, P. 688

16. Ibid., P. 737
17. Safeer Awan, Khas-o-Khashak Zamany: A Post-Modern Analysis, Mashmoola Ma'yar Issue-8, International Islamic University, Islamabad, 2012, P. 404
18. Mustansar Hussain Tarar, Khas-o-Khashak Zamany, P. 493
19. Ibid., P. 518
20. Ibid., P. 463
21. Wajahat Masood, Kitabi Silsila Asbaat, Issue-31, Hum-Jinsiat Number, April 2021, P. 63
22. Mustansar Hussain Tarar, Khas-o-Khashak Zamany, P. 530